اُٹھ کر بیٹھ گئی اور اپنا لباس درست کرنے لگی "میں دیکھتی ہوں —"

کمرے میں جمع شدہ ٹھنڈک سے اُس کا بدن ٹھٹھرا اور وہ شانوں پر ہاتھ رکھے باہر آ گئی — دھوپ ابھی نیچے نہیں آئی تھی اور نیچے لان میں اور بے ترتیب باڑھ میں اور لکڑی کے بوسیدہ پھاٹک میں کہیں کہیں دُھند کے جزیرے تیر رہے تھے۔ پرے اُس جھنڈ کے نیچے — شیشم اور جامن کے درختوں تلے ایک مور کھڑا تھا۔

فاطمہ کو وہاں اس بوسیدگی کے کمرے کے باہر بیٹھے ہوئے — اُس سویر کی یخ میں بیٹھے ہوئے اس کے کانوں نے خبر کی کہ اُدھر سات کمروں والی کوٹھی کے بڑے کمرے میں سے کوئی باہر آیا ہے کہ چٹخنی کھلنے کی آواز یہاں پہنچی تھی اور جو باہر آیا ہے وہ ایک عورت کے اطمینان سے باہر آیا ہے۔

فاطمہ کی کرسی سے ذرا پرے وہ مور کھڑا تھا — "می آؤں —" وہ اپنی موجودگی کو ثابت کرنے کے لیے ایک مرتبہ پھر بولا۔

"یا خدایا — یہ تو سچ مچ ایک مور ہے —" برگیتا کے شانے پر سے مشاہد کی آواز ایک ناقابل یقین حیرت میں گم آئی — "لیکن یہ آ کہاں سے گیا؟"

بابا نذیر احمد کے دل میں مکالمے چلتے رہتے تھے۔

اپنے آپ سے مخاطب، دوست جو گذر چکے تھے اُن سے... کبھی اُس ریت سے جو تلے تھی، ابھی تک صبح کی یخ بستگی سے۔ اُس دُھند سے جو راوی کے پانیوں پر بہت سے معلق تھی اور اب اُس میں سے کامران کی بارہ دری دھندلاتی نظر آنے لگی تھی اور کبھی بہاؤ سے جو سُست اور ٹھہرا ہوا سا لگتا تھا — اور بعض اوقات سرد ہوا سے وہ مخاطب ہوتا تھا اور اُس کے مکالمے چلتے تھے اور کبھی وہ مسکراتا تھا اور کبھی سنجیدہ ہو ہونٹ بھینچ لیتا تھا اور اپنے سامنے ایزل پر آرام کرتے کینوس پر نظر کرتا تھا اور پھر اس کے اوپر سے اپنی اُس کمپوزیشن کو دیکھتا تھا جو کئی روز سے دھیرے دھیرے تصویر منتقل ہو رہی تھی۔ کامران کی بارہ دری سے لگ کر بہتا ہوا دریائے راوی — صبح ہے... سردیوں کی سرد سویر میں — کہیں دُھند، کہیں سورج کی بجھی ہوئی کرنیں — اگلے دس پندرہ منٹ میں اسے سویر کی بجھی بجھی روشنی کے شیڈ اپنے بُرش میں لانے اور اُس کی سٹروکس سے کینوس پر منتقل کرنے تھے اسی لیے وہ جلدی جلدی اور تیزی سٹروکس لگا رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں سورج بلند ہو جائے گا اور روشنی قابو میں نہیں ہے گی۔

راوی بابا نذیر کی فکسیشن تھا۔

ہم عصر مصور کہتے تھے کہ بابا نذیر کا فن راوی پر آکر ٹھہر گیا ہے... وہ اس سے باہر نکل سکتا۔ اور بابا نذیر اول تو ایسی تنقید کے جواب میں صرف مسکراتا تھا اور اگر کچھ کہتا تھا تو صرف یہی کہتا تھا کہ پانی تو ایک سے نہیں رہتے، بہتے رہتے ہیں تو اُن کی کوئی تصویر صرف اُس ایک لمحے کے پانیوں کو قید کر سکتی ہے جو اُس وقت بہتے ہیں اور چلے جاتے ہیں تو میں ٹھہر نہیں گیا — ہاں اگر یہ رُکے ہوئے ہوتے، کوئی تالاب یا جھیل کی طرح تو کہا جا سکتا تھا کہ چند تصویروں کے بعد اُس سپاٹ میں کوئی سوال نہیں رہا، ممکنات کا

خاتمہ ہو گیا ہے۔

وہ پچھلے بیس برس سے صرف راوی، کامران کی بارہ دری، کشتیاں، پل، کنارے، واقع اونچے بند اور اُن پر جھکے آسمان کو پینٹ کر رہا تھا۔

سپاٹ پر پینٹ کرنا ایک انتہائی مشقت طلب کام ہے۔ صبح سویرے منہ اندھیرے گرمی ہو یا سردی اُسی سپاٹ پر پہنچنا یہ دعا کرتے ہوئے اُس میں کوئی تبدیلی نہ آگئی ہو۔ فلاں کشتی اگر ریت پر اوندھی پڑی تھی تو کسی نے اسے سیدھا نہ کر دیا ہو۔ پانی کی سطح وہی ہو جو کل تھی اور سب سے اہم بات کہ روشنی وہی ملے — اُسی زاویے پر اور اُسی تیزی سے جیسے کل ملی تھی۔

اور پھر وہ لوگ جو پکنک کے لیے آ جاتے تھے۔ سیر سپاٹے کے لیے.. اُن کے گروہ کے گروہ آپ کے کندھوں پر سے جھانک رہے ہیں۔ یہ کیا بنا رہے ہیں؟ یہ درخت ایسا نہیں ہے — یہ پانی تو گدلا بنا دیا ہے — اور ایسے بے شمار احمقانہ سوال۔ اس کے علاوہ کوئی تانگے والا آپ کو آفر کر سکتا ہے کہ آپ میرے تانگے پر شیر اور تاج محل بنا دیں، کوئی نودولتیا اس پیشکش کے ساتھ کہ کیا آپ میرے ڈرائنگ رُوم کی دیوار پر ایک عقاب بنا سکتے ہیں جس کے نیچے تو شاہیں ہے بسیرا کر — لکھا جا سکے.. لیکن ابھی صبح تھی۔ ابھی خدا کا شکر ہے کہ رونق میلہ شروع نہیں ہوا تھا اور وہ اکیلا تھا اور اُس کے پاس چند لمحے تھے صبح کی اِس پھیکی دُھند آلود روشنی کو قید کرنے کے لیے۔

اس نے بارہ دری کے حفاظتی پشتے کے ساتھ لگ کر بہنے والے پانی کو کینوس پر اُتارنے کے لیے برش اُٹھایا۔

یہ پینٹنگ بہت دنوں سے نامکمل تھی۔ آج اسے بہرطور مکمل کرنا تھا۔

وہ سٹروک لگانے لگا تو رُک گیا۔ اس نے برش کو ایک پیمانے کے طور پر اپنی آنکھوں کے سامنے کیا، بارہ دری، دریا کے پانی اور پشتے کو ماپا اور پھر کینوس پر ایک نظر ڈالی اور رُک گیا۔

بارہ دری کی قدیم سرخ اینٹوں کے ساتھ لگ کر دریا بہتا تھا اور وہاں اپنے نشان چھوڑتا تھا۔ جب اُدھر پہاڑوں میں برف پگھل کر نیچے آتی تھی تو پانی کی سطح بلند ہو کر محرابوں تک جاتی تھی اور سردیوں میں نیچے، پشتے سے نیچے تک پانی گر جاتا تھا۔ دریا میں جگہ جگہ جزیرے اُبھرتے تھے، اُن پر کچھوے رینگتے تھے — بابا نذیر جانتا تھا کہ سردیوں میں

راوی میں پانی بہت کم ہوتا ہے تو بارہ دری کی حفاظتی دیوار کی اینٹوں پر کہاں تک ہوتا

وہ سٹروک لگاتے لگاتے رُک گیا تھا —

پانی کی سطح بہت نیچے آ چکی تھی۔ وہ اُن پرانی اینٹوں کو بھی دیکھ رہا تھا جو آج تک نے نہیں دیکھی تھیں کیونکہ وہ مسلسل زیرِ آب رہی تھیں۔ ایسا کیوں دکھائی دیتا یہ تو ممکن نہ تھا کہ راوی میں پانی کم ہو گیا ہو۔ ہزاروں برسوں سے رواں قدیم پا روشنی آج کا راوی — اس میں پانی کم ہو رہا ہو۔

بابا نذیر نے سٹروک ادھوری چھوڑ دی، ایزل فولڈ کیا اور کینوس پیک کر کے ایک چین اور لاعلمی کی کیفیت میں موٹر سائیکل کے کیریئر پر باندھ کر وہ اپنے گھر کی جانب نہ ہو گیا — اُس کے اندر اب کوئی مکالمے نہ چلتے تھے، اندر خوف کی خاموشی تھی۔

اُس کے سٹوڈیو میں، دیوار کے ساتھ پچھلے دس برس میں پینٹ کیے ہوئے راوی کینوس تھے — اور اُن کے برابر میں وہ ادھوری تصویر بھی تھی جو آج ایزل پر تھی۔

بارہ دری کے ساتھ لگ کر بہتے پانی کی سطح ہر برس... نیچے ہو رہی تھی..

تصویروں میں فرق نظر آ رہا تھا.. اور اُس نے اس فرق کو پہلے کبھی محسوس نہیں تھا۔

راوی خشک ہو رہا تھا..

لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا...

ایک ہی سپاٹ سے، ایک ہی مقام سے بنائی ہوئی تصویروں میں پانی کی سطح مختلف

وہ درجہ بہ درجہ نیچے ہو رہی تھی۔

اور آج سویرے — اس نے بارہ دری کی اُن اینٹوں کو بھی دیکھ لیا تھا جو ہمیشہ زیرِ آب تھیں اور اب ظاہر ہو رہی تھیں۔

پانی کم ہو رہے تھے۔

چار چیزیں ہیں... اُن میں سے ایک کامران کی بارہ دری...

چار چیزیں ہیں جو ہر دسمبر میں مجھے بلاتی ہیں... اُن میں سے ایک شکار ہے، قادر آباد کے آس پاس —

سرکنڈوں سے ادھر تاریکی میں کم گہرائی والے پانی کے اوپر کُہر کی ایک پتلی چادر بچھی ہوئی تھی اور کشتی کی روانی اس باریک شیشے کی کرچیاں کرتی چلی جا رہی تھی... دُھند بہت گہری تھی اور اُس کے پار کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔

اندھیرے میں لَو دیتے ڈائل کو وہ آنکھوں کے قریب لایا اور ہندسے پھیل گئے، وہ یکجا نہ ہوئے تھے... اُنہیں پڑھنے کے لیے اسے قریب کی عینک درکار تھی جو وہ بھول آیا تھا... لیکن اُس کے بدن میں سفر کرتی ٹھنڈک بتاتی تھی کہ سورج نکلنے میں ابھی آدھ گھنٹہ باقی ہے۔

کشتی کی رفتار دھیمی ہوئی اور وہ سرکنڈوں کو روندتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ سرکنڈے ابھی سیدھے کھڑے ہیں اور ابھی کشتی کے آگے غلاموں کی طرح بچھے چلے جا رہے ہیں...

ملاح نے چپو اُٹھا لیے "جناب یہاں ٹھیک ہے؟"

"ہاں —"

"بالکل ٹھیک ہے جی؟" ملاح صرف "ہاں" کے جواب سے مطمئن نہ ہوا۔

"ہاں۔ بالکل ٹھیک ہے۔"

گہری دُھند میں سرکنڈوں کے اندر ایک تنہائی اُتر رہی تھی اور اُس نے مشاہد کے آس پاس اپنے آپ کو تعینات کر لیا یہاں تک کہ ہر سرکنڈہ الگ الگ تنہا ہو گیا اور وہ دُھند جو دھیرے سے پانیوں پر سے اُٹھتی تھی ٹھہر گئی اور اس دُھند کو بھی احساس ہوا کہ وہ بھی الگ ہے اُس بڑی دُھند سے جو قادر آباد کی جھیلوں پر چھائی ہوئی ہے...

کشتی کے گیلے پیندے پر تینوں شکاری تھیلے... برگیتا کے ہاتھوں کے بنائے ہوئے

ج اور کانی، ویڈرز والا تھیلا اور تیسرا تھیلا جس میں کارتوس ٹھنسے ہوئے تھے، روسی
ی کی بیکال ہاتھ میں لیے، جیسے پچھلے برس کے دسمبر کا ایکشن ری پلے ہو رہا تھا۔
اُس کے اندر شکار کے احساس میں، اس کی طلب اور دیوانگی میں، وحشت میں نہ
ی کمی ہو چکی تھی بلکہ اس بار وہ صرف زاہد کالیے کے بے پناہ اصرار کی وجہ سے آگیا
ے صرف ایک دوست کا دل رکھنے کی خاطر — ورنہ اسے پرواہ نہ تھی۔
آسمان پر سپیدۂ سحر تیزی سے پھیلتا جا رہا تھا لیکن دُھند بدستور نابینا اور سفید تھی
تنہائی کی تہہ گہری ہوتی جا رہی تھی — تنہائی اور اداسی کی تہہ... وہ، مشاہد اور
ے اُس کے بوجھ تلے دبے چلے جا رہے تھے — ہر سرکنڈہ الگ — اور دُھند بھی
... لیکن اس کے باوجود لکشمی مینشن وہاں آگیا... اُس کے فلیٹوں کی منزلیں ایک ایک
کے اُتریں اور ایک دوسرے کے اُوپر براجمان ہوتی گئیں یہاں تک کہ اُن کی چھتیں نظر
نے لگیں جن میں ایک مستطیل چھت پر فلیٹ نمبر 17 کی چھت پر مشاہد لیٹا ہوا تھا اور
ں کی کھلی آنکھوں پر جو آسمان تھا اس کی نیم تاریکی میں صرف ریگل چوک کے پار
نیڈرز" کے اوپن ایئر ریستوران میں سجاوٹ کے قمقموں کی ہلکی روشنی تھی... اور
ں میں اینجلا ناچ رہی تھی....
عشقے دا اِک پلنگ نواڑی وے اساں چانیاں وِچ ڈاہیا....
آپا جی تو بس آپا جی رہیں اور جس روز اس نے انہیں "ہائے موم" کہہ کر پکارا تھا
وں لگے چمٹے سے اُس کی مرمت ہوئی تھی... کتنے برسوں بعد اس نے قادر آباد کی دسمبر
ا صبح میں سرکنڈوں میں ساکت کشتی میں آپا جی کو یاد کیا تھا.... اُن کی ہڈیاں، نیچے قبر میں
ں کے نیچے... شائد سفید لٹھے کا کوئی ایک ٹکڑا سلامت ہو اور آپا جی کے سفید بال...
ے بہت دن، کئی برس یہ بے اختیار خواہش رہی کہ وہ کچی قبر کو اپنے ہاتھوں سے کریدے
ا پھر دیکھے کہ وہ کیسی ہیں... اب کیسی ہیں... یقیناً کرم خوردہ... اور... بال تو ہوں گے...
ت عرصے بعد اس نے ماں کو یاد کیا تھا۔
صفیہ یہ مشاہد ہے۔ یہ اچھا بچہ ہے — منٹو صاحب نے کہا تھا۔
آسمان صاف کیسے ہو سکتا ہے... اس کے چہرے پر راکھ کیوں نہیں ہے..
دن کے وقت شاہ عالمی جلتا ہوا سنائی دیتا اور رات کو دکھائی دیتا...
فلیٹ کی باون سیڑھیوں کے عین درمیان میں جا کر سمیعہ نے اُس کا ہاتھ دبوچ کر کہا

تھا "اوئے مجھ سے ڈرتے ہو —"

اوپر نیچے اور درمیان...

لکشمی مینشن اس سرکنڈوں والی دُھند بھری تنہائی میں اس لیے فلیٹ در فلیٹ اُتر تھا کہ پچھلی شب اُس نے سمیعہ کو دیکھا تھا... اور ایک بروتھل ہاؤس میں... ایک ڈھلتی عمر خاوند اور مسلسل مخمور رہنے والا خاوند اُس کا مقدر تھا... پہلے ٹیلی فون آپریٹر... پھر گرلز ہوسٹل کی وارڈن... خاوند کی رحلت اور تین بیٹیاں... اور غربت... بیٹیاں چٹی گوری بھری بھری.. اور گندے کچے مکانوں سے تنگ آئی ہوئیں... چنانچہ ایک آئیڈیل سیٹ اَپ...

"مشاہدی... تم کمرے میں آئے ہو تو میں نے تمہیں پہچان لیا... باجیوں کا کیا حال ہے —" اس پر گوشت بہت تھا اور اُس کی آنکھیں اس گوشت میں روپوش ہو رہی تھیں "پر یار تم کہاں آ گئے ہو؟"

مشاہد نے کمال کی طرف دیکھا جو ایک گنجا مڈل ایجڈ... شوگر سے سکڑتا ہوا بیزار شخص تھا اور امریکہ میں دو شادیوں کی ناکامی کے بعد چند روز کے لیے پاکستان واپس آیا تھا... اور ایک پاکستانی لڑکی چاہتا تھا... فار اولڈ ٹائمز... مشاہد قطعی طور پر ایسے رابطوں اور ملاپ کا شائق نہ تھا لیکن کمال اسے کھینچ لایا تھا... تم بے شک باہر انتظار کرنا... میں گیا اور میں آیا... اور وہاں سمیعہ تھی..

"یہ میری بیٹیاں ہیں...."

کمال بھی سنائے میں آ گیا.. "چلو مشاہد..."

"اب بھی مجھ سے ڈرتے ہو مشاہدی —"

لکشمی مینشن دُھند میں تحلیل ہونے لگا...

سردی بہت تھی.. ایک اُونی مفلر کانوں کو لپیٹتا اس کے منہ کے آگے گیلا ہو رہا تھا۔

سپیدۂ سحر سرکنڈوں کے اندر سرائت کرتا ہوا انہیں الگ الگ کر رہا تھا۔

"کیا ہوا؟ —" آج ڈیڑھ بجے صبح... برگیتا نے حیرت سے پوچھا تھا۔

"کچھ نہیں..." وہ کروٹ بدل کر دوسری جانب کھڑکی کو دیکھنے لگا "یہ میری عمر ہے..."

"نہیں مشیل..." برگیتا نے اس کی ننگی کمر پر ہاتھ پھیرا اور اُسے جگہ جگہ چھوا

نہیں..."

"امپوٹنسی کے لیے کوئی وقت تو مقرر نہیں... پلیز مجھے مت چھوؤ..."

برگیتا خوفزدہ ہو کر پرے ہو گئی تھی... دراڑ بڑھتی جا رہی تھی..

اوپر بلند چھت کے عین نیچے جو روشندان تھا اس نے پہلی بار اُس کی جانب دیکھا اور وہاں وہ پرندہ تھا... کاغذ کا، ایک دھاگے سے لٹکا ہوا — "برگیتا —"

"یس ڈارلنگ..." وہ اُس کے غصیلے پن سے مزید خوفزدہ ہو گئی۔

"یہ... کاغذی پرندہ... تم نے لٹکایا ہے؟"

"ہاں —"

"کیوں؟"

"تم نے اِسے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا تھا اور مجھے خیال آیا کہ روشندان کے آگے لٹکتا ہوا اور ہوا کے زور سے جھولتا ہوا بہت زبردست لگے گا.. میں نے بہت مشکل سے ایک بلند سیڑھی منگوا کر اِسے لٹکایا ہے — تمہیں پسند نہیں؟"

کیا وہ جانتی ہے اور صرف مجھے چڑانے کی خاطر اُس نے اتنی سرد مہری کی ہے...

اُس نے یہ کیوں کہا تھا کہ وہ لڑکی مجھ جیسی ہے —

اُس نے اُسے دیکھا نہ تھا لیکن یہاں قادر آباد کی جھیلوں میں.. سرکنڈوں میں روپوش کشتی میں.. مرغابیوں کے انتظار میں اپنے اونی مفلر میں سرد سانس لیتے ہوئے — وہ اُسے دیکھ سکتا تھا۔ وہ کرسٹین جیسی ہی ہو گی... لمبی تڑنگی اور بے باک اور — اُس میں کچھ آمیزش ہو گی.. وہ اُسے دیکھ سکتا تھا... ابھی ابھی.. ایک وحشت بھری خواہش نے اُسے جکڑ لیا ایسے کہ وہ اس کی تکمیل کے لیے اس کشتی سے نکل کر قادر آباد ریسٹ ہاؤس تک پیدل میں چلتا ہوا جا سکتا تھا اور پھر وہاں پارک کی ہوئی وِلیز جیپ پر اس نیم تاریکی میں علی پور، گوجرانوالہ اور سادھوکے سے فرلانگ بھرتا ہوا لاہور پہنچ سکتا تھا اگر اُسے کوئی یہ یقین دلا دیتا کہ وہ اس سات کمروں والی کوٹھی کے باہر پھاٹک کے ساتھ کھڑی ہو گی اور وہ اُسے دیکھ سکتا تھا... اپنی آمیزش کو ایک نظر دیکھ سکتا تھا۔

لیکن یہ واہمہ بھی ہو سکتا تھا۔ برگیتا فاطمہ کی وجہ سے شک میں مبتلا بھی تو ہو سکتی

ایک پرندہ جو سات کمروں والی کوٹھی کے بڑے کمرے کے روشندان میں لٹک رہا

تھا — ایک اور پرندہ جس کے بارے میں تمامتر مقامی تحقیق کے باوجود یہ نہیں جانا جا سکا تھا کہ وہ کیسے اور کہاں سے آیا تھا... جو لان میں گھومتا تھا.. اور کچھ نہیں کھاتا تھا۔ پچھلے تین روز سے بھوکا تھا اور صرف "می آؤں می آؤں" کر کے اپنی موجودگی کی اطلاع جانے کس کو دیتا تھا... اور تیسرا پرندہ جس کے پروں کی سائیں سائیں کے اُس کے کان منتظر تھے... وہ چار پرندے جن کا خوشی سے کوئی تعلق نہ تھا..

پالے کی ماری ہوئی خشک اور بد رنگ گھاس والے لان میں کین کی کرسی پر فاطمہ دسمبر کی دھوپ میں مگن اپنے آپ میں مگن سامنے دیکھتی تھی اور سامنے برگیتا اُسے بہت دیر سے دیکھتی تھی اور اُسے بتاتی نہیں تھی کہ فاطمہ میں تمہارے سامنے بیٹھی ہوں۔ وہ تھوڑی سی مجرم محسوس کر رہی تھی۔ وہ اُس کی معذوری کا فائدہ اُٹھا رہی تھی لیکن... وہ اُسے دیکھنا چاہ رہی تھی... اِس عورت میں کیا تھا جس نے مشاہد کو اُس سے بیگانہ کر دیا تھا، کونسی ایسی قوت تھی جو اُن کے رشتے کے گلیشیر میں ایک گہری اور اندھی پھلانگ نہ سکنے والی دراڑ تخلیق کر سکتی تھی... اُس میں کچھ بھی نہ تھا... وہ دسمبر کی دھوپ میں مگن ایک بوڑھی ہوتی ہوئی اندھی عورت تھی.... اُس میں کچھ بھی نہ تھا...

"فاطمہ —" وہ پہلی بار بولی..

"جی —"

"میں بہت دیر سے آپ کو دیکھ رہی ہوں... آپ کو بتائے بغیر۔"

"میں جانتی ہوں —"

طویل خاموشی اور دسمبر کی دُھوپ اور جامن، پیپل، املتاس اور شیشم کے درختوں تلے کھڑے مور کی ایک "می آؤں" کے بعد برگیتا بولی "آپ کیا جانتی ہیں؟"

"سب کچھ —" وہ کہنے لگی۔ اُسے دیکھتے ہوئے جیسے اُس کی سیاہ آنکھیں واقعی اُسے دیکھتی ہوں.. اور برگیتا میں ایک خوف آیا کہ فاطمہ ہمہ وقت ایک کھیل میں تھی... جس میں وہ نابینا ہونے کی اداکاری کر رہی تھی اور وہ نہیں تھی اور اُسے دیکھ سکتی تھی "صرف یہ جان لو کہ بابو راؤ پٹیل میری زندگی میں وہ واحد شخص تھا جس پر میں فدا ہوئی... بہت بُری طرح... اتنی بُری طرح کہ اس کے لیے میں نے اپنا مذہب چھوڑ دیا... اس کے بعد آج تک... تمہیں فکرمندی کی ضرورت نہیں —"

برگیتا چپ رہی۔ اسے غور سے دیکھتی رہی لیکن کہیں بھی فاطمہ کے چہرے پر کوئی شکن نہ اُبھری جو پوشیدہ رکھنے والوں کے چہروں پر خود بخود اُبھرتی ہے۔

"اس نرم دھوپ کے موسم میں جب ہوا سرد ہے... میں ان دونوں کو اپنی جانب سفید بنچ کی جانب آتے ہوئے دیکھتی ہوں اور اُن کے لمبے سکارف اُن کے قدموں میں اُلجھتے آتے ہیں۔ اُن دونوں کے ہاتھوں میں ایک خاص بلندی پر پائپ ہیں جو بجھے ہوئے ہیں... دھاری دار نیلے سوئٹروں میں تم خیال نہیں کر سکتیں کہ وہ کیسے لگتے تھے..."

"ہاں.. میں خیال نہیں کر سکتی کیونکہ میں ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی.." برگیتا نے ہنس کر ایک خاص خوش مزاجی سے کہا۔

"تو میری جانب بڑھتی ہوئی تصویر میں سے — بابو غائب ہو گیا اور مشاہد باقی رہ گیا۔ اسی لیے میں یہاں آئی تھی... بس اتنی سی بات ہے۔ تمہیں فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں —"

"نہیں میں فکرمند نہیں ہوں —"

"تم ہو —"

"ہاں میں ہوں —" یکدم برگیتا نے بے اختیار اور بہت ہی مغلوب ہو کر کہا "فاطمہ ہمارے درمیان ایک دراڑ آ گئی ہے۔"

وہ اپنے سامنے دیکھتی رہی — اور کچھ نہ بولی۔

"اس کاروبار میں شراکت بہت زیادہ ہو چکی ہے... پہلے مردان تھا... میں اُسے بہت پسند کرتی ہوں بلکہ آپ کے سامنے اگر میں اقرار کر لوں تو کوئی مضائقہ نہیں کہ بعض اوقات میں مردان اور مشاہد میں فرق نہیں کر پاتی۔ دونوں مجھے ایک سے عزیز ہو جاتے ہیں۔ کبھی ایک پلڑا جھک جاتا ہے اور کبھی دوسرا... لیکن فاطمہ، مردان میرا حصہ بھی لے جاتا ہے — اب آپ ہیں اور..."

"میں کبھی اس کاروبار میں تمہارے حصے کی خواہش نہیں کروں گی —"

کناروں سے لٹکتی گھاس جو پانی کے اندر تھی گلتی اور سڑتی تھی اور بُو دیتی تھی... ایک گیلی بُو اور پھر سرکنڈوں کی گیلاہٹ تھی جو دُھند میں لپٹی اس کی ناک تک آتی تھی۔ اور یہ بُو ہمیشہ رہے گی جب کہ میں سیمنٹ کی سلوں کے نیچے کعبے کی جانب منہ، سفید لٹھے

میں لپٹا — لیکن ابھی بند کھلیں گے، پہلے پاؤں کے اور وہ الگ الگ ہوں گے اور پھر منہ کے.. منہ ول کھبے شریف — اور اُس پر مٹی... دھک مکوڑے اور ڈسٹ اِن ٹو ڈسٹ...

اے ہوسٹ آف ڈیفوڈلز....

چار چیزیں ہیں...

گوشت پوست اور پروں کی پوٹلی یہ نہیں جانتی کہ وہ جو اُڑان میں ہے اور اُس اُڑان کی اِس بلندی پر آسمان کی چھت کی قربت میں اور زمین جہاں سے ایسے نظر آتی ہے جیسے خمیر شدہ آٹا تو وہاں نیچے بہت نیچے جھیلوں کا ایک سلسلہ ہے جس پر ابھی دُھند اُٹھ رہی ہے اور وہیں کہیں سرکنڈوں کا ایک جھنڈ ہے جس میں گھاس گلتی سڑتی ہے وہاں پوشیدہ ایک کشتی ہے جس میں بیکال کو کندھے سے لگائے مشاہد علی مشیل ہے.... گوشت پوست اور پروں کی پوٹلی نہیں جانتی۔

مشاہد کے کانوں میں وہ سرسراہٹ اُتری جو ایک زمانے میں اُس کے لیے ذیبوسی کی سمفنی "آئی بیریا" کا کلائمکس تھی اور جو اُس کے جذبات کو ایسے اُبھارتی تھی جیسے بہت دن ہوئے برگیتا کا سیاہ وجود اس کے ساتھ کپکپاتا اور گیلا ہوتا تھا۔

وہاں آسمان پر جہاں مکمل اندھیرے کی بجائے سفیدی آگے آ رہی تھی وہاں مرغابیوں کا ایک بے پناہ ہجوم تھا اور اُن کے پَروں پر اُس بلندی پر سورج کی پوری کرنیں پڑتی تھیں اور اُن کے پَروں کو یُوں سنہری کرتی تھیں جیسے وہ سب ایک ہی پرندہ ہوں۔ پورے آسمان پر محیط ایک داستانوی پرندہ... ایک دیوزاد پکھیرو جس کے سنہری پَر آہستگی سے حرکت کرتے ہوئے نصف دنیا پر سایہ کر رہے تھے۔

مشاہد نے اپنی رَف اینڈ ٹف بیکال کو اونچا کیا اور اُس کی مکھی میں سے آسمان کو سیاہ کرتے شُوکتے پرندوں کو دیکھا اور یہ جانا کہ اگر وہ نشانہ لیے بغیر ہی فائر کر دیتا ہے تو بھی قادر آباد کی نصف جھیل پھڑپھڑاتی مرغابیوں سے اٹ جائے گی...

اس نے بیکال کو اونچا کیا اور پھر نیچے کر لیا۔ طلب، دیوانگی اور شکار کی وحشت نے مکمل طور پر اُس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

اس میں خواہش باقی نہ رہی تھی۔

جو کالیاں کے قریب ساہن پال سے گذر کر جب وہ سیلابی بند کے اوپر رُکے تو اس
رُکے کہ انہیں بیلے کے اندر سے بھینسے کے ڈکرانے کی آواز آئی تھی... صرف ایک
— اور پھر خاموشی چھا گئی۔

"بہن یا تم نے فائر کیوں نہیں کیا —" زاہد کالیا ناراض ہونے لگا "میں نے پوری
گی میں اتنی مرغابیاں نہیں دیکھیں۔ آسمان سیاہ ہو رہا تھا بہن یا —"

"اس لیے کہ چار مرغابیوں کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں اور میں زیادہ سے زیادہ
مرغابیاں مار گراتا، ایک نیل سر اور دو...."

زاہد کالیے نے خاموشی اختیار کر لی۔

اُن دونوں میں ایک اداسی تھی جو بٹ خیلہ کے باہر وے سائڈ ریستوران کے
واڑے میں دریائے سوات کے کنارے رکھی تین کرسیوں تک جاتی تھی جہاں وہ تینوں
ے تھے — نہ صرف وہاں بلکہ یہاں قادر آباد کے دسمبر میں بھی یہ پہلی بار تھی جب
ڑارشد اُن کے ہمراہ نہ تھا۔

یہ اداسی بھی تھی اور بے بسی بھی —

کالیے کی نسان پٹرول میں درجنوں مرغابیاں بے حس اور آخری پرواز کی تھکاوٹ
بے دم اور مُردہ پڑی تھیں اگرچہ اُن میں سے چند ایک کا گوشت ابھی تک حدت میں
ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔

"مشاہدی یار تم اُس قید سے نکلو۔ بہن یا اُس سات کمروں والی کوٹھی کی تنہائی اور
بائی کے بدن کی قید سے — میرے پاس آؤ — بلکہ آ جاؤ — میں تمہارے لیے
اور مجرا کراؤں گا.... قسم سے ایسی گشتیاں لے کر آؤں گا کہ تم ٹن ٹن کر اُٹھو گے۔"

"نہیں —"

"مشاہدی ان کے ساتھ دو بول پڑھوا لیں تو یہ پھیکی پڑ جاتی ہیں، اِن میں چس نہیں
ا.... قانونی شے میں وہ چس نہیں ہوتا جو غیر قانونی میں ہوتا ہے... یہ مجھ سے پوچھو... آؤ
؟"

"میں نے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے —"

"نہ جاؤ — "کالیا بجھ گیا "نہ جاؤ۔ کوئی فائدہ نہیں۔"

اونچے سیلابی بند کے برابر میں سورج کی زرد اور سردی میں بجھتی کرنوں میں جنگلی بیروں کی جھاڑیوں اور گھاس پھونس میں ابھرتی قبروں کے قریب ایک نسان پٹرول اور ایک ولیز جیپ کھڑی تھیں اور ان میں سے ایک میں وہ شخص تھا جس کے جینز ان ابھرتی قبروں میں سے کسی ایک میں دفن ایک ان پڑھ لیکن، دانش کی گہری حِس رکھنے والے کسان کے بدن میں سے آئے تھے اور وہ لاعلم تھا کہ اس کی قبر کونسی ہے....

کلّر زدہ — کسی حد تک بنجر زمینوں میں سے ایک چھوٹی سی تارکول کی سڑک اُبھر کر اوپر ہوتی تھی اور اپنا دامن نیچے گرنے سے بچاتی تھی جس پر مشاہد کی وِلیز سفر کرتی تھی۔ علی پور کے نواح میں رنجیت سنگھ کی بارہ دری کے آثار نظر آئے اور گذر گئے۔

اور پھر کسے پرواہ تھی کہ وہاں ہوسٹ آف لوٹسز کھلتے ہیں سڑک اور ریلوے لائن کے درمیان جوہڑوں میں — کسے پرواہ تھی۔

وہ رُکے بغیر لاہور کی جانب ڈرائیو کرتا رہا اور اُس کی جیپ کے پچھواڑے میں ایک بھی مرغابی نہ تھی — صرف اَن چلے کارتوس اور بندوق کی سرد نالی تھی۔

تین چیزیں ہیں جو ہر دسمبر میں... اور اُن میں سے ایک قادر آباد کی جھیلوں کے آس پاس شکار — نہیں تھا۔

"ہو اِز دیئر؟"

مردان کے پاؤں اندھیرے میں منجمد ہوئے اور وہ ٹھٹک گیا — وہاں کون ہو سکتا
— کئی مرتبہ اندھیرے میں تربیت کے دوران کاکول کے نواح میں یا پھر جنگ میں،
ٹ اور کھلنا کے آس پاس یہی سوال سکوت کو توڑتا تھا — "ہالٹ۔ ہو اِز دیئر؟" اور
ن کے جواب میں مردان اپنے آپ پر جبر کر کے حالات سے سمجھوتہ کرتے ہوئے خاموش
تا تھا ورنہ ہمیشہ اُس کا جی چاہتا تھا کہ وہ چیخ کر کہے، آئی ایم مردان علی سن آف چوہدری
ندداد خان اینڈ یو کین گو ٹو ہیل —

لیکن یہاں جس آواز نے وہاں کون ہے کا سوال کیا تھا وہ کرخت اور فوجی نہ تھی...
م، ڈری ہوئی نسوانی آواز تھی۔

سات کمروں والی کوٹھی میں پچھلے ایک برس میں بہت ساری تبدیلیاں آ چکی تھیں
اُن کی قسم سے باہر تھیں۔ بھائی جان کس قسم کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

پھاٹک کو اس نے حسب عادت ایک لونگ جمپر کی طرح زقند بھر کر عبور کیا تھا
رچہ لینڈنگ پر اُسے یہ وارننگ ہڈیوں کی جانب سے مل گئی تھی کہ مردان تم ہمیں آخری
آزمائش میں ڈال چکے... آئندہ کے لیے اپنی عمر اور ہماری خستگی یاد رکھنا۔ بہت دیر بعد
چلنے کے قابل ہوا۔ کوٹھی کے اندر بہت گہرا اندھیرا تھا جو شیشم کے قد آور درختوں پر
اُترتا ہوا سیاہ دُھند کی مانند ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لیتا پھیلا ہوا تھا۔ اس اندھی رات
جہاں کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا اس نے اپنے سامنے کھڑے پرندے کو دیکھ لیا۔ یہ
وہ اُسے تب نظر آیا جب وہ زقند بھر کر پھاٹک کو پھلانگتا ہوا لان میں لینڈ کر رہا تھا اور اُس
ہڈیوں نے اُسے آخری آزمائش کی وارننگ دی تھی...

وہ بہت دھیمی آواز میں بولا تھا "می آئی — "

بھائی جان یہ کس قسم کی زندگی گزار رہے ہیں۔

مور جیسے راستہ روکے کھڑا رہا — اسے مہین آنکھوں سے تکتا رہا۔ یہ آنکھیں تاریکی میں صاف اور الگ الگ دِکھتی تھیں، اسے گھورتی ہوئی۔

فاصلوں کی کمند سے آزاد، میرا دل ہے کہ شہر میونخ ہے — اور شہر میونخ میں ابھی کرسمس میں چند روز باقی تھے کہ وہ پہنچ گیا۔ پچھلے برس کا کفارہ ادا کرنے کے لیے — اور سات کمروں والی کوٹھی کے لان میں ایک مور اس کا راستہ روکے کھڑا تھا۔ اس نے مستطیل کمرے کی جانب اس کی کسی کھڑکی میں روشنی کی رمق باہر آنے کی آس میں ادھر دیکھا اور ادھر بھی سیاہی جیسے ابد سے تھی —

مور کی گردن بہت لمبی تھی۔

وہ بڑی آسانی سے اُسے دبوچ کر مروڑ سکتا تھا... لیکن یہ سُندر بن تو نہیں تھے جہاں کے جانور بھی اُس کی تاک میں تھے اور اُس کے پاؤں سے رسیّوں کی طرح لپٹتے تھے اور اُسے جھاڑیوں میں پوشیدہ جلتی آنکھوں سے دیکھتے تھے، آوازیں ایسی نکالتے تھے کہ دل دہل جائے اور انسان کے حواس سرد ہو جائیں.. ہم حالت جنگ میں نہیں ہیں مردان علی — تم نے صرف اتنا کرنا ہے کہ اس مور کے دائیں یا بائیں جانب ہو کر چپکے سے گذر جانا ہے — بس۔

اور وہ دائیں طرف سے گذرا تو مور نے گردن گھما کر یہ بھی نہ دیکھا کہ کون گذر گیا ہے۔ اس کی لمبی گردن فضا میں بلند رہی اور مہین آنکھیں پھاٹک کو دیکھتی رہیں جیسے وہ نابینا ہو۔

اور اب جب کہ وہ درختوں کے جھنڈ سے پرے شیشم کے رُکھوں تلے اپنے ٹھکانے کی طرف آیا تھا، راستہ ٹٹولتا، تلاش کرتا اور کوٹھری کے بوسیدہ کواڑ کھلے تھے جن میں سے اُس کے پاؤں آگے آئے تھے اور ٹھٹکے تھے یہ سن کر کہ کوئی نسوانی آواز ہے جو پوچھتی ہے..... کہ ہو از دیئر؟

دسمبر کی رات میں لاہور کے ریلوے سٹیشن میں سے جو کہ ایک دنیا تھا، آباد روشن اور پُرشور وہ پیدل چلتا ہوا حسب عادت — ماڈل ٹاؤن ایسے وقت میں پہنچا تھا جب ہر جانب نیند اور سناٹے تھے۔ پھاٹک پر سے جھانک کر اُس نے پورچ کی چھت تلے دیکھا اور وہاں مشاہد کی جیپ موجود نہ تھی۔ چار چیزوں میں سے ایک نے — قادر آباد کی جیلوں نے اسے بلا لیا تھا۔ چونکہ دسمبر تھا۔ بھرجائی برگیتا کو رات گئے یونہی بے آرام کرنا

نے مناسب نہ جانا اور یہی مناسب جانا کہ اپنے گھاس بھری چھت والے کمرے میں
ے اور کچے فرش پر سلیپنگ بیگ بچھا کر دو چار گھنٹوں میں سپیدہ سحر کرے اور پھر
ائی کے کمرے کے باہر جا کر اپنی آمد کا اعلان کرے — بھابھی برگیتا — میری کرسمس
ان ایڈوانس۔

لیکن یہاں اُس کے قدم منجمد ہو گئے تھے اور وہ ٹھٹک گیا تھا — ہو از دیئر؟

"میں مردان ہوں — آپ کون ہیں؟"

ادھر سے جس نے جواب دینا تھا دوہرے اندھیرے میں تھی اس لیے اسے باہر
ے ہوئے کچھ وقت لگا "مشیل کے بھائی؟ — چھوٹے بھائی؟"

"ہاں" مردان ازحد حیران ہوا۔

دوہرے اندھیرے میں بولنے والی نے اندھیرے کی ایک تہہ کو ہمیشہ کے لیے خیرباد
اور پھر بولی "مشیل تمہارا بہت ذکر کرتا تھا — بلکہ صرف تمہارا ہی ذکر کرتا تھا۔ بابو
کے بارے میں بات کرتا تھا تو ہمیشہ کہتا تھا، اُس کا چھوٹا بھائی مردان ہے — تُو تم
ن ہو؟"

"جی —"

"تمہارے بدن میں وہی مہک ہے۔ تم دونوں کے پسینے کی بُو ایک سی ہے —"

"آئی ایم سوری" بہت پشیمان ہو کر اس نے کہا "میں ایک لمبے سفر سے آیا ہوں
راچی سے اِس لیے... اپنے آپ کو... صاف ستھرا نہیں کر سکا —"

"اگر تم نہ بولتے تو میں تمہیں مشیل ہی جانتی — میں سو رہی تھی — تم نے مجھے
یا۔"

"آئی ایم سوری —"

"کھڑے کیوں ہو — بیٹھ جاؤ — ادھر میرا بستر ہے۔ تم پائنتی پر بیٹھ سکتے ہو۔
یں جاگ گئی ہوں —"

باہر تو تاریکی اور پوشیدہ خاموشی بدستور رہی لیکن گھاس بھری چھت والی بوسیدہ
ی کے اندر جہاں حاملہ بلیاں بسیرا کرتی تھیں وہاں ہر شے الگ الگ ہو کر صاف صاف
ے سامنے آنے لگی — سفید بالوں والی ایک خاتون، آنکھیں اور وہ بڑی اور دلکش
ہت آہستگی سے سلوموشن میں جھپکاتی عین سامنے دیکھتی تھی، مردان کی جانب نہ

دیکھتی تھی۔

وہ پائنتی پر اس احتیاط سے بیٹھا جیسے اُسے یقین ہو کہ یہ بستر اور اس پر بیٹھی ہوئی عورت چینی کے کھلونے ہیں — باریک اور ریزہ ریزہ ہو جانے والے اور یہ — ٹوٹ جائیں گے... اس احتیاط سے بیٹھا "آپ کون ہیں؟"

"میں فاطمہ ہوں۔" اس نے گردن میں بل دے کر براہ راست مردان کی آنکھوں میں دیکھا... اور وہ کس تسلسل کے ساتھ اسے دیکھے چلی جا رہی تھی، ایسے تسلسل کے ساتھ جو بے آرام کرتا تھا کہ یہ کیوں میری جانب اس طرح دیکھے چلی جا رہی ہے۔

"فاطمہ؟"

"بابو کی بیوی — بابو مشیل کا بہترین دوست تھا انگلینڈ میں — بہت برس ہو گئے۔"

وہ اُٹھتے ہوئے کہنے لگا "میں باہر سو جاتا ہوں۔ آپ آرام کریں۔"

"نہیں —" وہ تیزی سے بولی "آپ اپنا ہاتھ مجھے دیں" فاطمہ کا ہاتھ اس کے سامنے آیا اور اس کی انگلیاں ہولے ہولے ہلنے لگیں۔

"جی؟"

"اپنا ہاتھ —"

مردان نے اپنا ہاتھ آگے کر دیا اور صرف اُسی لمحے اُس نے سمجھا اور جانا کہ وہ اُسے دیکھ نہیں سکتی کہ اُس کا ہاتھ ہوا میں اُسے تلاش کرتا رہا جب تک آگے ہو کر اس نے تھام نہ لیا "میں دیکھ نہیں سکتی مردان — آپ یہاں بھی سو سکتے ہیں — یوں بھی میں شائد آپ سے عمر میں بڑی ہوں۔"

فرش میں سے گھاس سر نکالتی تھی۔ کچھ بوٹے تھے جن میں چھوٹے چھوٹے پھول لگے ہوئے تھے اور گیلاہٹ تھی اور اُس پر مردان نے اپنا سلیپنگ بیگ کھولا۔

"آپ فرش پر سوئیں گے؟"

"مجھے چارپائی پر سوئے ہوئے — بہت برس ہو گئے ہیں۔"

"کوئی پرانی چوٹ یا کمر کا درد وغیرہ —"

"ہاں — ایک پرانی چوٹ!"

"مشاہد تو نہیں ہے — شکار پر جانے والی جیپ کے انجن میں ایک الگ تھ

چینی ہوتی ہے جو میرے کانوں نے سُنی تھی۔ اس نے جیپ سٹارٹ کی تو میں اس
پوری میں...''

''جی —'' بھائی جان کو دسمبر میں بہت سی چیزیں بلاتی ہیں... وہ صبح سویرے واپس
ہیں گے... زیادہ دیر نہیں۔''

''ہم اتنی دیر باتیں کر سکتے ہیں.. میں اب سو نہیں سکتی —''

''ہاں —''

وہاں مستطیل کمرے میں — برگیتا نے ایک اور کروٹ لی۔ بے خوابی اور
چینی کم نہ ہوتی تھی...

''می آؤں —'' مور پھر بولا۔

آج مشاہد کو کیا ہوا تھا؟ کیا واقعی امپوٹنسی کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں یا وہ خود
بردار تھی... وہ اب مشاہد کو اُبھار نہیں سکتی تھی — وہ دراڑ جو درختوں کے جھنڈ کے
ہمسار ہوتی کوٹھڑی میں خوابیدہ تھی — یا نہیں تھی — وہ دراڑ شائد ذمہ دار نہیں
مشاہد علی مشیل کے ساتھ اُس کے دن پورے ہو چکے تھے — جو زندگی اُس کے
ب میں تھی اس کے دن پورے ہو گئے تھے اور بڑھ نہیں سکتے تھے۔ جیسے ہر انسان کی
عین ہوتی ہے ایسے ہر رشتے اور جذباتی تعلق کی بھی ایک عمر ہوتی ہے، وہ اختتام کو پہنچ
ے تو لاکھ منت سماجت اور بدن کی کشش اس میں ایک دن کا بھی اضافہ نہیں کر سکتی.. وہ
قطعی طور پر ذمہ دار نہیں تھی۔

کروٹ لیتے ہوئے اس کے کانوں نے ٹھہری ہوئی تاریکی اور چپ میں جو کچھ بہت
ے سے حرکت کرتا تھا اس کی سرسراہٹ سنی تھی — باہر کوئی تھا — مور کے سوا بھی
تھا۔

مالی شریف نے آس پاس کے تمام گھروں سے یہ ظاہر کیے بغیر کے اُن کے ہاں لان
ایک مور کھڑا ہے، استفسار کیا تھا کہ کیا اُن کا کوئی پالتو پرندہ گم ہوا ہے اور جواب نفی
تھا۔ صرف ایک گھر کے اندر جانے کی وہ جرات نہیں کر سکتا تھا جہاں بلند اور گھنی
ں میں سانپ بسیرا کرتے تھے اور جس کے لان میں متعدد خونخوار کتے گھومتے تھے اور
ہاں کوئی رانی رہتی تھی۔

برگیتا اُس کے لیے فکرمند تھی، وہ جب سے آیا تھا اُس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ وہ

گردن بلند کیے شکایت بھری نظروں سے اُن کی طرف دیکھتا رہتا او. اپنے آگے رکھی گئی خوراک کو قطعی طور پر رغبت کی بجائے رنجش کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔

برگیتا نے اپنے پورے بدن پر ایک نابینا کی طرح محسوس کرتے ہوئے ہاتھ پھیرا، اپنے آپ کو جاننے کے لیے، جانچنے کے لیے اور وہ ہر ابھار پر ٹھہری اور ہر نشیب پر رُکی یہ جاننے کے لیے کہ وہ کیسے قصور وار تھی — کہیں بھی کوئی نمی نہ تھی، گیلاہٹ نہ تھی جو مشیل کی اُس کے بدن میں موجودگی کا پتہ دیتی اور یہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

اوپر، رات کے باوجود، بلند روشن دان کے آگے کاغذ کا پرندہ دکھائی دیتا تھا۔ ماضی ـ اتھاہ جنگلوں میں سے نکل کر حال کے ریگزاروں میں پرواز کرتا ہوا... پرندے تیرا بھید یا ہے؟ ایک اور کروٹ بدلنے کے بعد بھی جب اُس کی آنکھیں نیند سے آشنا ہونے کے قریب نہ ہوئیں تو وہ اُٹھ بیٹھی... اپنے آپ کو نائٹ گاؤن میں کیا اور پھر کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ دسمبر کی یخ اور کٹیلی ہوا گاؤن کے اندر اس کے بدن میں چلنے لگی اور وہ ٹھٹھرتی ہوئی وہیں اندھیرے میں دم سادھے کھڑی اس پرندے کو دیکھنے لگی جس نے صرف ایک بار گردن گھما کر اسے دیکھا تھا اور پھر اپنی مہین آنکھیں پھانک پر رکھ دی تھیں یہ دیکھنے کے لیے کہ کون اندر آتا ہے —

"اولاد کی محبت کو میں بھی جانتی ہوں —" سفید بالوں والی عورت بول رہی تھی "جب وہ ماتھے پر تلک لگائے ایک مجبور اور نفرت بھری نگاہ تم پر ڈالتے ہیں تب بھی دل میں سے خون کا ایک فوارہ چھوٹتا ہے اُن کی اُلفت کے لیے — میں اُن کی داسی بن کر رہ لیتی اگر وہ مجھے رکھ لیتے — پر وہ بہت شرمندہ تھے اور میں اپنی آل اولاد کو کسی کے آگے شرمندہ اور بے وقعت ہوتا نہیں دیکھ سکتی اس لیے آ گئی — شوبھا آپ کی بیٹی ہے؟"

"ہاں — اس نے میرے اجتماعی احساس سے جنم لیا ہے —"

ایک بُو ٹا تھا جو سلیپنگ بیگ کے کناروں پر اُس کی ناک کی قربت میں آتا تھا اور اُس میں ایک چھوٹا سا زرد پھول تھا جو اُس کی ناک پر کھجلی سی کرتا تھا اور اُس میں جو مہک تھی وہ کچی اور بدذائقہ سی تھی — اس نے سر جھٹک کر اپنے آپ کو اس ناہنجار بو سے الگ کیا "میں اُس کی شادی کر رہا ہوں۔ آپ کب تک یہاں ہیں؟"

فاطمہ بہت دیر تک کچھ نہیں بولی۔ پہلے تو وہ ہر سوال کے جواب میں فوراً کچھ نہ

کہہ دیتی لیکن اب اپنے سامنے دیکھتی رہی اور پھر بولی تو بہت دور سے اور اپنی
وری کے بوجھ تلے دبی ہوئی بولی "میں زیادہ دیر تک یہاں نہیں ہوں — مجھے اس گھر
یکنوں میں اپنی شکلیں دکھائی دیتی ہیں۔ تصویریں جن میں میں اپنے آپ کو دیکھتی
اور مجھے ڈر ہے کہ جب میں اس گھر سے نکلوں گی تو باقی ماندہ زندگی میں میرے سامنے
سادہ دیوار ہو گی جس پر کچھ بھی نہ ہو گا... اُسی دیوار کے ساتھ میں نے اپنی زندگی
ارنی ہے تو کچھ دن اپنی شکلیں دیکھ لوں — کتنے دن؟ بس کچھ دن —"

"کراچی کی صورتِ حال کچھ ٹھیک نہیں —" وہ بالکل الگ راستے پر سفر کرنے
فاطمہ سے پرے ہو کر مردان ایک اور ٹریک پر چلا گیا "بیروت میں بھی بالآخر ایک میز پر
نا پڑا... لیکن وہ تب بیٹھے جب ہر سو کھنڈر تھے۔ کم سے کم کھنڈروں میں مذاکرات کی میز
یہی دانش مندی ہے — ابھی تو قتل، قتل کو جنم دے رہا ہے..."

"مے آئی کم اِن؟"

دونوں اس آواز پر چونک گئے۔

"بھرجائی آپ —" مردان اپنے سلیپنگ بیگ میں اُلجھتا اپنے آپ کو الگ کرتا
بڑی دِقّت سے اُٹھا اور برگیتا نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا اور ایسے لگایا جیسے
ت کا افسوس کرنے کے لیے گلے لگاتے ہیں۔ وہ مردان سے لپٹ کر ایسے کھڑی تھی جیسے
ی دنیا ویران اور بے آباد ہے اور اس میں صرف ایک سہارا، ایک ستون ہے جو کہ
ان ہے۔

برگیتا نے ایک ہچکی بھری اور اس میں ایک ناخوشی تھی جو اُس کے آنسوؤں میں
تی ہوئی اُس کے رُخساروں پر بہنے لگی۔

"کیا ہوا بھرجائی — کیا ہوا؟" مردان نے اس کی پُشت کو شفقت سے تھپکا۔

"کچھ نہیں —"

"آپ ناخوش ہیں؟"

اندھیرے میں اُس کے بدن کے اندھیرے میں اس کے سفید دانت نظر آئے
— اس لمحے، جامن کچنار اور املتاس کے درختوں تلے اس گھاس کی چھت والی
ی میں، تمہارے سامنے — میں بہت ناخوش ہوں مردان —"

"لیکن پیاری بھابھی جان —" اس نے برگیتا کے کپکپاتے بدن کو اپنے سے الگ